ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نگاری

*ڈاکٹر ضیاء الحسن

Abstract:
This paper reveal some aspects of the criticism of Dr. M. Ali Siddique it tells us that Dr. M. Ali Siddique is a progressive critic he tried to introduce Marxist ideology in Urdu criticism he is the critics who wrote against the modern literary movements like Jadeedyat structuralism and post modernism. He is the very fast Urdu critics who not only introduce the relation of linguistics to the criticism but also told the Urdu literary tradition, the trend of this type of criticism our anti progressive.

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ہمارے عہد کے سب سے اہم ترقی پسند نقاد اور دانش ور ہیں۔ میں نے ''سب سے اہم'' بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے کیوں کہ موجودہ عہد تک آتے آتے بیش تر سینئر ترقی پسند نقاد اب اس دنیا میں نہیں رہے اور بعد میں آنے والوں نے تنقید ادب کو سنجیدگی سے اختیار نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نظری اور عملی دونوں حوالوں سے متواتر اور مسلسل لکھا ہے جس کی تائید ان کی شائع ہونے والی کتابوں سے ہوتی ہے۔ ''توازن'' کے بعد ''روپے کی سرگزشت''، ''نشانات''، ''مضامین اشاریے''، ''جہات''، ''ادراک''، ''جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ''، ''غالب اور آج کا شعور'' جیسی وقیع تنقیدی کتب ان کے تنقید ادب کو سنجیدگی سے اختیار کرنے کا بین ثبوت ہیں۔ شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر قاضی عابد کی مرتب کردہ ''توازن کی جہات'' انھیں خراج تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے لکھنے کا آغاز اردو میں جدیدیت کی تحریک کے بعد کیا۔ جس میں کئی ترقی پسند تحریک سے منحرف ادبا بھی شامل تھے۔ ابتدائی دور میں ان کے سامنے جدیدیت ایک سوال تھا جب کہ اردو کے اکثر ادبا اس تحریک میں شمولیت اختیار کر چکے تھے اور ترقی پسند تحریک ایک لحاظ سے اپنی قوت کھو چکی تھی۔ ترقی پسندوں نے جدیدیت کو بھی حلقہ ارباب ذوق کی طرح اپنا مخالف قرار دے کر یک سر مسترد کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر محمد علی صدیقی یہ کار آساں اختیار کرنے کے بجائے مشکل راہ اپناتے ہیں۔ انھوں نے مشرق و مغرب میں جدیدیت کے جملہ خدوخال کا تجزیہ کیا اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی نشان دہی کی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ فی الاصل ترقی پسندی ہی جدیدیت ہے یا جدیدیت ترقی پسندی ہے۔ وہ برطانیہ اور فرانس کے ہیئت پرست ادیبوں کی کاوشوں کو مضر خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ادیب اپنی انا کے اسیر ہیں اور انسان

* اُستاد شعبہ اُردو، اورینٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور

سے زیادہ انھیں اپنی انا کا اثبات درکار ہے۔ اسی طرح وہ عسکری جیسے روایت پرستوں کے بھی حق میں نہیں ہے جو روایت کو جامد خیال کرتے ہیں۔ وہ ایلیٹ کے تصور روایت کو سراہتے ہیں جو روایت کے مردہ عناصر کو ترک اور زندہ عناصر کو اختیار کرنے کی بات کرتا ہے جب کہ عسکری رینے گینوں اور فرتھ جوف شواں کے زیراثر روایت کو اسیر مکان قرار دے کر جامد بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں انسان کا ہزاروں سال پر مشتمل سفر انسان کے ذہن اور مادے کی مسلسل ارتقا پذیری کا مرہونِ منت ہے، لکھتے ہیں:

> ''سائنس کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ اپنے موقف میں تبدیلی کو اپنی شکست تصور کرنے کے بجائے اس نوع کی تبدیلی کو اپنی ترقی قرار دیتی ہے۔ نیوٹن اور آئن سٹائن کا فرق دو افراد کے نقطۂ ہائے نظر میں سے کسی ایک کی ہزیمت ہو سکتی ہے لیکن یہ کسی طور پر سائنس کی ہزیمت نہیں ہے جب کہ مذہبی مبلغ اسے اپنی ہزیمت قرار دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے دور کے سارے مسائل اس عدم تطابق کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں جو سائنسی ترقی اور مذہبی عقائد کے متوازی دھاروں سے عبارت ہو کر رہ گیا ہے۔''(۱)

جدیدیت کے بعد انھوں نے اپنی توجہ ساختیات اور اس سے پیدا ہونے والی نئی لسانی نظریات پر مرکوز کی۔ ان نظریات کو پرکھتے ہوئے بھی انھوں نے اپنا بنیادی پیمانہ ترقی پسندی ہی کو بنایا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جو نظریہ انسانی تقدیر کو بدلنے کی بات نہیں کرتا، رجعت پرستانہ ہے کیوں کہ وہ انسان کی تاریخ میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کرتا۔ وہ ان لسانی تھیوریوں کے یک سر خلاف نہیں ہیں لیکن انھیں ان میں سماجی افادیت بھی نظر نہیں آتی۔ ان کے خیال میں کسی مثبت نظریے کی غیر موجودگی میں سماجی/انسانی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ساختیات کو منطق اور گرائمر کی لاطینی گردان قرار دیتے ہیں جو انسانی فکر کے ارتقا میں معاون نہیں ہے، اس لیے اس کی افادیت بھی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان تھیوریوں کی مغرب میں تو شاید کوئی گنجائش ہو جہاں لسانی تجربہ گاہیں دستیاب ہیں لیکن مشرق میں جہاں شرح خواندگی خوف ناک حد تک کم ہے، ایسی تھیوریوں کی بات کرنا محض مغرب زدگی کی علامت ہے۔ وہ معانی کے عدم تعین کو مذاہب اور مابعد الطبیعیات کے خلاف سازش اور ان کے لیے ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں۔

> ''ساختیات نے پھر سے عروض، صرف و نحو اور منطق پر اس حد تک زور دیا کہ نظریات اور اقدار کی بحث غیر ضروری ہو گئی ہے۔ خیر سے مغرب میں تو ابھی تک لاطینی گرامر سکولز موجود ہیں، منطق اور فلسفے کا اچھا خاصا زور ہے اور ساختیاتی فکر کے علماء کے پاس اپنی لسانی تجربہ گاہیں بھی موجود ہیں لیکن ہمارے یہاں نہ زبان کی معقول تعلیم کا نظام ہے اور نہ اس کے

متعلقات پر زور ہے بلکہ ان دنوں لبرل آرٹس سے بے اعتنائی کا دور دورہ ہے۔ بس ایک ''شوق دربدری'' وافر مقدار میں موجود ہے جو ہمیں تاریخ اور اقدار سے ہٹانے اور ازکار رفتہ مغربی نظریات سے مرعوب کرنے میں مصروف ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر صاحب ساختیات سے پہلے لسانی تشکیلات کی تھیوری کو بھی رد کر چکے ہیں۔ ان کے خیال میں لسانی تشکیلات اور ساختیات وغیرہ جدیدیت سے بھی زیادہ مضرت رساں ہیں۔ جدیدیت کے بعض عناصر کو تو اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن یہ لسانی اجتہادات اور لسانی مباحث ایک ایسے معاشرے میں جہاں شرح خواندگی قابل توجہ ہے۔ معاشرے کو ادب سے ہی بدظن کرنے کا باعث ہے جس کی وجہ سے ادبی رسائل جو پہلے دس سے پندرہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتے تھے، اب بہ مشکل پانچ سو کی تعداد میں شایع ہوتے ہیں اور وہ بھی قاری کو ترستے ہوئے۔

ساختیات وغیرہ کی نسبت مابعد جدیدیت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر زیادہ سخت ہے۔ ساختیات کو وہ منطق و گرامر کا ایسا گورکھ دھندہ قرار دیتے ہیں جو انسان کو اپنے زندہ مسائل سے بے نیازی کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن مابعد جدیدیت گلوبلائزیشن کو تقویت دینے والی تھیوری ہے، گویا اس کے پس پردہ عالمی مالیاتی کارپوریشنوں کے عزائم کارفرما ہیں۔ یہ نقطۂ نظر دیگر کئی نقادوں اور دانش وروں کی طرف سے بھی آیا ہے لیکن نئی تھیوریوں سے منسلک نقاد عام طور پر اسے ان ادیبوں کی جہالت اور ان تھیوریوں سے ناواقفیت قرار دیتے ہیں، خاص طور پر ترقی پسندوں کو ہر نئی علمی دریافت میں سرمایہ دارانہ مقاصد کارفرما نظر آتے ہیں لیکن یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ عالمی مالیاتی کارپوریشنوں نے اپنے سرمایہ دارانہ عزائم کی تکمیل کے لیے ہمیشہ ایسے دانش وروں کی خدمات حاصل کی ہیں جو اپنی ذہانت فروخت کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ یہ تھنک ٹینک ان کے لیے نئی نئی تھیوریاں وضع کرتے ہیں جنھیں وہ اپنے تیز ترین ذرائع ابلاغ کے ذریعے انسانوں کے ذہنوں میں راسخ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مجاہد کامران جو فزکس کے عالم میں اور جن کا ادبی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، لکھتے ہیں:

''کچھ تنظیمیں ایسی ہیں جن میں ان (دنیا کے امیر خاندان) کے مفادات کے تحفظ کے لیے پالتو دانش ور جنھیں Think Tank کے معتبر ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، شب و روز سوچ بچار میں مصروف رہتے ہیں......ان تھنک ٹینکس کی سوچ بچار کو مخصوص جرائد میں شائع کیا جاتا ہے اور ان سے کتابیں لکھوائی جاتی ہیں جن کی وسیع پیمانے پر تشہیر ہوتی ہے۔ ''تہذیبوں کا تصادم'' بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے۔'' (۳)

ڈاکٹر مجاہد کامران نے یہ کتاب بہت تحقیق سے لکھی ہے اور اس میں بیان کردہ حقائق براہ راست اور مستند ذرائع سے حاصل کیے گئے ہیں، لہٰذا ہر وہ نظریہ جو سرمایہ داری نظام خصوصاً عالمی مالیاتی کارپوریشنوں کے مفاد اور انسانوں کے خلاف ہو، اس پر اس نہج پر غور وفکر ضرور کرنا چاہیے، چاہے جہالت کے جتنے بھی الزامات کیوں نہ برداشت کرنا پڑیں۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی بنیادی طور پر مغربی ادب کے مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مغربی نظریات اور ادب کے ساتھ ان کا تعلق بعض مغرب سے مرعوب نقادوں اور ادیبوں کی نسبت زیادہ ہے جس کا اظہار ان کے مضامین سے بھی ہوتا رہتا ہے۔ جدیدیت ہو، ساختیات ہو یا مابعد جدیدیت، وہ جب ان موضوعات پر لکھتے ہیں تو اردو میں ہونے والے کام پر بات کرنے سے پہلے مغربی میں ہونے والے کا کام کا جائزہ پیش کرتے ہیں تا کہ اردو میں ہونے والے کام پر بات کرنا آسان بھی ہو جائے اور قابل فہم بھی۔ یہاں ان کے کام کے ساتھ ایک اختلاف ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان جدید تھیوریوں کے بارے میں لکھنے والوں اور اس کے مخالفین میں سے اکثر ناقدین کی نسبت ان تھیوریوں کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں اور ان کی رسائی اصل مآخذ تک ہے لیکن انھوں نے ان کے مثبت پہلوؤں اور مضمرات کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا۔ میرے خیال میں وہ بہت سے دانش وروں کی نسبت اس کام کے زیادہ اہل ہیں۔ انھیں اس موضوع پر ایک مفصل کتاب کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے تا کہ بات محض بیانات یا الزامات تک محدود نہ رہے بلکہ اس کا تفصیلی تجزیہ ہو سکے۔ اس اختلاف کی وضاحت میں ڈاکٹر صاحب کے مابعد جدیدیت پر نقطۂ نظر کے حوالے سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں اپنے مضمون ''مارکس اور موجودہ عالمی بحران، ایک تجزیہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''انقلاب کے خواب کو ہمارے ذہنوں سے نکال پھینکنے کے لیے ایک گلوبل ثقافتی ایجنڈا ابھی سرگرم عمل ہے جس کی بجا آوری اور متابعت کے لیے مابعد جدیدیت کا شوشہ چھوڑا گیا ہے یعنی ایجنڈے کی رو سے اب کوئی مسئلہ مرکزی اہمیت کا حامل نہیں رہا۔ تمام بنیادی مسائل ختم ہو چکے ہیں، صرف فروعی مسائل یعنی حاشیے پر نظر آنے والے مسائل ہی اہم ہیں اور وہی مسائل حل بھی کیے جا سکتے ہیں۔''(۴)

ایک اور مضمون ''مابعد جدیدیت اور نیا عالمی سیاسی نظام'' میں لکھتے ہیں:

> ''عالمی ادب میں مابعد جدیدیت ایک بین الاقوامی میڈیا سوسائٹی کے قیام کے لیے گلوبلائزیشن کی تحریک کو تقویت بخشنے کا دوسرا نام ہے اور اس لیے فکری اور ادبی طور پر مختلف

نقطۂ ہائے نظر کے وجود کے اثبات کی دوڑ میں طاقت ورکو زیادہ طاقت ور اور کم زور کو اپنی ''نحیف آواز'' برقرار رکھنے کی تسلی ہے۔ اس لیے فرد پر اجتماع، جز پر کل، ثقافتی اقلیت کو ثقافتی اکثریت پر فوقیت دینے کی بات کی جاتی ہے تا کہ عالمی معاشی نظام کے بل ڈوزر سے فرد، جز اور ثقافتی اقلیت کے لحاظات اور جوازات یک سر ختم نہ ہو سکیں۔''(۵)

اسی طرح ''نیا عالمی نظامِ مابعد جدیدیت اور ادب'' میں لکھتے ہیں:

''ادب اور ثقافت کے شعبوں میں مابعد جدیدیت نئے عالمی نظام کا حصہ ہے۔ متن کی افادیت کے سارے مباحث End of History کے نظریے سے جڑے ہوئے ہیں یعنی یہ نظریہ کہ دنیا جن کلاسیکی مسائل مثلاً عزیت اور امارت کے درمیاں آویزش سے گھری ہوئی تھی اور اس کے خاتمے کے لیے جمہوریت اور سوشلزم کے درمیاں جو رسہ کشی ہو رہی تھی، وہ اب ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف جمہوریت ہی واحد طرز حکومت ہے اور جمہوریت کے ساتھ اس کا وہ Illusion یا Myth بھی جو ایک معاشی طور پر قلاش اور بے زر افراد کو مسند اقتدار پر براجمان ہونے کے خواب دکھاتا ہے۔ صرف خواب ہی نہیں دکھاتا بلکہ اس یقین میں مبتلا کر دیتا ہے کہ عزیت ایک بے معنی صورت حال ہے۔''(۶)

ان اقتباسات سے کچھ نہ کچھ ادراک تو ہوتا ہے کہ مابعد جدیدیت اور عالمی مالیاتی کارپوریشنوں کے ایجنڈے میں کئی اشتراکات ہیں لیکن مکمل ادراک نہیں ہوتا۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں تفصیلات واضح ہیں لیکن ان تفصیلات کے اظہار کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ اگرچہ گلوبلائزیشن کے مضمرات اب دنیا پر واضح ہوتے جا رہے ہیں لیکن گلوبلائزیشن اور مابعد جدیدیت میں کس کس سطح پر اشتراکات ہیں، مابعد جدیدیت کے عالموں کے ان مالیاتی کارپوریشنوں سے کیا روابط ہیں، مابعد جدیدیت کے خدوخال اپنی تفصیلات میں کہاں کہاں ان مالیاتی کارپوریشنوں کے مقاصد پورے کرتے ہیں، یہ تمام سوالات ابھی تشنۂ جواب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو تسلی رکھنی چاہیے کہ اگر انھوں نے اس موضوع پر تفصیلی اظہارِ خیال نہ کیا تو شاید ان سوالات کے جوابات دیر تک منظر عام پر نہ آ سکیں کیوں کہ ان کے لیے جس مطالعے، مشقت اور دانش کی ضرورت ہے وہ کافی طور پر اردو دان طبقے میں مفقود نظر آتی ہے۔ اس تفصیلی اظہار خیال کے بغیر ان کا نقطۂ نظر بھی محض بیان یا الزام تراشی کی حیثیت اختیار کرے گا۔ جو عام طور پر ترقی پسند دانش وروں سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا اس وقت ان عالمی مالیاتی کارپوریشنوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے اور اس سے نکلنے کا واحد راستہ سوشلزم ہے کیوں کہ دنیا کی سب سے بڑی

مذہبی برادری مسلمان اپنے حکمرانوں کے توسط سے انھی کارپوریشنوں کے غلام اور دلال بن کر رہ گئے ہیں۔ خود بھی پس رہے ہیں اور دنیا کے مستقبل کو بھی داؤ پر لگایا ہوا ہے۔ اب واحد راستہ یہ ہے کہ سوشلسٹ دانش ور ماضی میں کی گئی غلطیوں کو دہرائے بغیر کوئی ایسا راستہ دریافت کریں جس پر چل کر بلاتخصیص مذہب وملت انسانیت اس زبوں حالی سے نکل سکے اور دنیا کے ایک ہزار خاندانوں کے پاگل پن سے نبرد آزما ہو سکے جنھوں نے عوام تو عوام حکمرانوں کو بھی اپنا آلہء کار بنا رکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے جہاں مابعد جدیدیت کے مضر انسانیت اوصاف کی طرف اشارہ کیا ہے وہاں اس کی اس خوبی کو بھی سراہا ہے کہ یہ ادبی اور ثقافتی سطح پر ایک لچک دار نظریہ ہے۔ قبل ازیں جدیدیت میں دوسرے نظریوں کی قبولیت نظر نہیں آتی۔ یہ نظریہ معاشیات کے ضمن میں غیر لچک دار ہونے کے باوصف ادب وثقافت میں قبولیت کا رویہ روا رکھتا ہے۔ شاید معاشیات میں سخت گیری کا سدباب ادبی وثقافتی لبرل ازم کے ذریعے کر کے انسانوں کو تسلی دینا مقصود ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نہ ساختیات اور نہ ہی مابعد جدیدیت کو کلیتاً رد کرتے ہیں بلکہ ان کے مضر انسان پہلوؤں پر گرفت کرتے ہیں۔ یہی وہ توازن ہے جو ان کی تنقید میں ان کے پہلے مجموعے ''توازن'' کے ساتھ ہی نظر آنا شروع ہوا تھا اور جو ۲۰۰۷ء میں شایع ہونے والے مجموعے ''ادراک'' تک نظر آتا ہے۔ اس توازن کو شہزاد منظر نے ترقی پسند رویوں کی مجموعی تبدیلی کے ساتھ منسلک کیا ہے۔

> ''محمد علی صدیقی نے تنقید میں ترقی پسندی کا مسلک اس وقت اختیار کیا جب اس کی بہت سی خامیاں واضح ہو چکی تھیں۔ ان کے ہاں وہ ڈوگماٹزم نہیں ملتا جو ان کے پیش رو ترقی پسندوں مثلاً سردار جعفری وغیرہ کے ہاں عام ہے۔ وہ دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ادبا و شعرا کی بھی فراخ دلی کے ساتھ تعریف وتحسین کرتے ہیں۔'' (۷)

محمد علی صدیقی روایت کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قدیم کلاسیکی ادب کے جاندار عناصر زندہ روایت کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک روایت کی جدلیات یہ ہے کہ یہ جدید نظریات کی آویزش سے متحرک ادبی عناصر کو چن لیتی ہے اور یوں ادب کا تخلیقی دریا اپنے بہاؤ کو قائم رکھتا ہے۔ وہ روایت کو رد کرنے کے عمل کو رجعت پسندانہ اور غیر ادبی قرار دیتے ہیں اور اسے ''مجنونانہ روش'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مارکس، اینگلز اور لینن ادب کی اسی صحت مندی کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے لینن کی مثال دی ہے جس نے مایا کوفسکی کے اس رویے کو نا قابل فہم قرار دیا تھا کہ وہ ماضی کے عظیم ادبی ورثے کو دریا برد کرنا چاہتا تھا۔ ترقی پسند روایت کے تعمیری اجزا

کو قبول کرتے ہیں کیوں کہ ان سے زندگی میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح زندگی دم بدم تغیر پذیر ہے، اسی طرح ادبی روایت بھی مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ غیر تعمیری عناصر خارج ہوتے رہتے ہیں اور نئے تعمیری اور زندگی کو بڑھاوا دینے والے عناصر اس میں شامل ہوتے رہتے ہیں- ان کی اس خوبی کا اعتراف پروفیسر ممتاز حسین یوں کرتے ہیں:

> ''محمد علی صدیقی ان گم کردہ راہ ترقی پسندوں میں نہیں ہیں۔ وہ ایک متوازن ذہن رکھتے ہیں اور کسی قسم کی طفلانہ انتہا پسندی کا شکار نہیں ہیں۔ وہ اپنے ماضی اور اپنی ادبی روایت دونوں کا ایک درست احساس رکھتے ہوئے اپنے معاشرے کو اس کی زبوں حالی سے نکال کر ہر قسم کے استحصال سے پاک ترقی کی سمت لے جانا چاہتے ہیں۔ چناں چہ ان کی اصلی وفاداری زندگی کے ساتھ ہے نہ کہ خالی خولی لفظ کے ساتھ۔''(۸)

محمد علی صدیقی نے روایت کے ساتھ جدیدیت کی بحث بھی چھیڑی ہے۔ ان کے خیال میں ترقی پسندی اور جدیدیت ایک ہی بات ہے کیوں کہ ترقی پسند نظریہ اپنے اندر جدید معنویت رکھتا ہے۔ وہ عرف عام میں جدید ادیبوں کو جدید نہیں کہتے کیوں کہ ان کا خیال یہ ہے کہ وہ زندگی کی معنویت میں چوں کہ کوئی اضافہ نہیں کر رہے، اس لیے انھیں جدید تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ''جدیدیہ'' کہا جا سکتا ہے۔ اس لفظ میں انھوں نے جدت پسند ادیبوں کی تحقیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدیدیت اردو ادب کا ایک ایسا رجحان یا تحریک ہے جو ساٹھ کی دہائی میں ترقی پسندوں کی ملائیت اور فکری تشدد پسندی کے خلاف شروع ہوئی۔ ترقی پسندوں کا خیال یہ تھا کہ ادب کو معاشرتی مسائل ہی بیان کرنے چاہئیں اور یہ مسائل بھی ایسی زبان اور بیان میں ادا کرنے چاہئیں جس کو مزدور سمجھ سکیں۔ جدیدیت کے علم برداروں نے اس قسم کی تمام پابندیوں کو غیر ضروری بلکہ ادب کے لیے ضرررساں قرار دیا اور موضوع کے برعکس فن و ہیئت و اسلوب کو اہمیت دی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس تحریک میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو کبھی ترقی پسند رہے تھے یا ترقی پسند نظریۂ ادب کے حامی تھے۔ ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، آل احمد سرور اور وارث علوی کے نام بے حد نمایاں ہیں۔ محمد علی صدیقی کا نظریہ یہ ہے کہ جدیدیت اور ترقی پسندی ایک ہی رویہ ہے۔ اصل ترقی پسندی یہ ہے کہ زندگی اور سماج کی معنویت میں اس سے کیا اضافہ ہوا ہے۔ محمد علی صدیقی جہاں جدیدیت پسندوں کے خلاف ہیں، وہاں ان نام نہاد ترقی پسندوں سے بھی نالاں ہیں جو ترقی پسندی کے نام پر رجعت پسندی بلکہ رجعت پرستی میں مبتلا ہیں۔ یہ وہ ادیب اور نقاد ہیں جو ایسے مغربی مفکرین کے پیروکار ہیں جو بنیادی طور پر یاسیت پسند ہیں۔ محمد علی صدیقی

کی ایک تخصیص یہ بھی ہے کہ انھوں نے مغربی ادب پر خوب لکھا اور ایسے مغربی دانشوروں کی دانش کی قلعی کھولی جو ناامیدی، مایوسی اور بے دلی پیدا کرتے ہیں۔ محمد علی صدیقی کے نزدیک ایسے احساسات انسان میں نراجیت اور شکست خوردگی پیدا کرتے ہیں جو معاشرے کے لیے کسی طور بھی بہتر نہیں ہے۔ انھوں نے جس طرح فرسودہ اور یاسیت پسند فکر کو جدید بنانے کی حقیقت طشت از بام کی ہے اس طرح ترقی پسندانہ فکر کے نام پر لایعنی خیالات کا بھی قلع قمع کیا ہے۔ جس وقت ترقی پسند اہل قلم ترقی پسند تحریک کے کمزور پڑنے اور نام نہاد جدیدیت کا طوفان اٹھ کھڑے ہونے کی وجہ سے مایوسی اور کنفیوژن کا شکار تھے اور ترقی پسند فکر پر ان کا یقین ڈھیلا پڑ چکا تھا اور وہ رجعت پسندانہ جدیدیت کو ترقی پسندی کا نام دے کر فرار کی راہ تلاش کرنے یا خود کو فریب دینے میں مصروف تھے، محمد علی صدیقی نے بڑی خوداعتمادی اور جرأت کے ساتھ ترقی پسندانہ نظریے اور خیالات کی حمایت کی اور ترقی پسندوں کا اپنے نظریے پر اعتماد بحال کیا اور ان میں لکھنے کے نئے عزم کو بحال کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ’’ترقی پسند اور جدیدیت پسند دونوں کے ہاں یاسیت اور رجائیت کے آثار تلاش کیے جا سکتے ہیں چناں چہ یاسیت کو صرف جدیدیت کے ساتھ لازم و ملزوم کرنا کسی طرح بھی درست نہیں اور یہاں مجھے محمد علی صدیقی کے ساتھ شدید اختلاف ہے۔‘‘(۹)

محمد علی صدیقی نے بھی پاکستانی کلچر کے سوال پر غور و فکر کیا ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر موجودہ دور کے ہر غور وفکر کرنے والے انسان نے ضرور سوچا ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ نقطۂ نظر بھی ہے۔ محمد حسن عسکری سے لے کر محمد علی صدیقی تک جتنے بھی دانشوروں نے اس موضوع پر لکھا ہے، ان میں سے بیش تر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہمیں پاکستانی کلچر کو نہ تو محض وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب تک محدود کرنا چاہیے اور نہ محض مذہب پر اس کی بنیاد رکھنی چاہیے بلکہ یہ دونوں ہی بنیادی عناصر کے طور پر پاکستانی کلچر کا حصہ ہیں۔ کسی ایک کو اختیار کرنے کی صورت میں ہمیں ایک محدود کلچر کا تصور حاصل ہوتا ہے جو پاکستان کے سبھی لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے اور جس سے کلچر میں گہرائی اور وسعت پیدا نہیں ہوتی۔ وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب ہزاروں سال پرانی ہے اور اس کا ہماری سرزمین اور ہماری رسوم و عادات و مزاج سے گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح مذہب بھی ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے اور اس کے بغیر بھی ہم روحانی طور پر ادھورے ہیں، اس لیے پاکستانی کلچر کی بات کرتے ہوئے ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لکھتے ہیں:

> ’’یہ علاقہ دراوڑی عہد سے لے کر آریائی، یورپی آریائی اور سامی النسل حکمرانوں کے غلبہ

سے گزرتا ہوا وسطی ایشیائی حکمران خاندانوں کے سیاسی غلبہ کا شکار ہوا۔ اس کے بعد انگریز حکمران وارد ہوئے۔ اس طرح اس علاقہ میں مسلم حکمرانوں اوران کے اعمال کی ثقافت اور مقامی ثقافت ردوقبول کے شعوری اور غیر شعوری عمل سے گزرتی ہوئی ایک ایسے موڑ پر پہنچی جسے ہم ثقافتی سنگم کا نام دے سکتے ہیں۔ ہم نے مسلم قوم کی سیاسی تاریخ اور علاقائی ثقافتوں کی تاریخ میں مماثلتیں کرنے کی بجائے انھیں ایک دوسرے کا نعم البدل سمجھنے کی ایسی خواپنائی کہ بعض حضرات کے لیے ہمارا لوک ورثہ اور تاریخ دو متوازی دھارے بن گئے ہیں حالانکہ دونوں ہی ایک بڑے تناظر کے دو اہم رخ سمجھے جا سکتے تھے۔'' (۱۰)

محمد علی صدیقی نے ادبی مسائل پر لکھنے کے علاوہ تخلیق اور تخلیق کار پر بھی کافی کچھ لکھا ہے۔ شہزاد منظر کا یہ کہنا کہ وہ عملی تنقید سے گھبراتے ہیں اور نظری بحثیں پسند کرتے ہیں، کچھ زیادہ قابل قبول نہیں ہے کیوں کہ ان کی کتاب توازن کے علاوہ بھی ان کی عملی تنقید کے نمونے مختلف رسائل میں شایع شدہ ان کے مضامین کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی عملی تنقید کی ایک خوبی ان کا تجزیاتی انداز ہے۔ وہ بات کی تہہ میں اترنے کے جویا نظر آتے ہیں۔ دوسری خوبی وسیع الذہنی اور وسیع القلبی ہے جس کا ثبوت ضیا جالندھری، اطہر نفیس اور مجید امجد پر ان کی تحریریں ہیں جو غیر ترقی پسند ادیب تھے۔ اس کا ایک ثبوت کروچے پر ان کی کتاب بھی ہے جس کے خلاف ترقی پسندوں نے ہمیشہ محاذ قائم رکھا اور جسے انھوں نے فاشیت کا حاشیہ بردار بنا کر رکھ دیا۔ اس حوالے سے محمد علی صدیقی کا انداز زیادہ متوازن نظر آتا ہے۔ غالب اور اقبال کے حوالے سے ترقی پسندوں کا نقطۂ نظر ہمیشہ کنفیوژن کا شکار رہا ہے۔ اقبال اتنے بڑے شاعر تھے کہ ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں اس لیے ان کے بارے میں ہر دور میں ترقی پسندوں نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ پہلے دور میں اقبال کو فاشسٹ قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ دوسرے دور میں ان کو روشن فکر شاعر تسلیم کر لیا گیا اور موجودہ زمانے میں ترقی پسندوں نے اقبال کو ترقی پسند شاعر بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں علی سردار جعفری کے ساتھ محمد علی صدیقی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ محمد علی صدیقی خود بھی مارکسی اور اشتراکی پس منظر میں ترقی پسند نہیں ہیں اس لیے انھوں نے اقبال کو بھی ان کی فکر کی وسعت، فکری حوالے سے دنیا بھر کے فکر و فلسفہ سے متاثر ہونے اور اسلام کا جدید نقطۂ نظر دینے کی وجہ سے ترقی پسند قرار دیا ہے۔ اقبال کی شاعری پر ان کا کام وقعت کا حامل ہے۔ اسی طرح غالب کو بھی انھوں نے راست بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ محمد علی صدیقی عام طور پر ادب کا جائزہ سماجی، سیاسی اور معاشی پس منظر میں لیتے ہیں۔ مثلاً پریم چند اور مجنوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''(۱) منشی پریم چند نے اردو افسانے کو عوام دوستی، حق پرستی اور سیاسی آزادی کے تصورات دیے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کو وسیع تر سماجی تبدیلیوں اور ذہنی تحریکوں کا متحمل بنانے کی بھرپور سعی کی۔''

''(۲) مجنوں کی فکر کے دائرے نے اردو زبان کے ادب دوست مڈل کلاس یا پھر کثیر اللسانی معاشرے کے مفادات سے منزہ فکری کاوش کا احاطہ کیا۔''(۱۱)

محمد حسن عسکری پر لکھتے ہوئے انھوں نے عسکری کے فکری انقلابات پر بات کی ہے اور یہ نقطۂ نظر دیا ہے کہ عسکری کی فکر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی دیانت داری پر شبہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ انھوں نے جو نظریہ اختیار کیا دیانت داری سے کیا۔ عسکری ابتدا میں مقصد اور مقصدیت کے کٹر مخالف رہے لیکن آخر کار وہ بھی اس کے قائل ہو گئے۔ لکھتے ہیں:

''اب عسکری صاحب مقصد اور مقصدیت کا مذاق اڑاتے نظر نہیں آتے۔ چوں کہ انھوں نے اپنی وابستگی کے رنگ کا انتخاب کر لیا ہے اور جو شخص اسلام کے نظریہ اجتماعیت اور سیاست کے مضمرات سے واقف ہے، اس سے یہ حقیقت کسی طرح پوشیدہ نہیں کہ اسلام ایک اجتماع کوش نظام حیات ہے اور اس میں انفرادیت، بے مقصدیت اور نراجیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔''(۱۲)

اسلام اور عسکری کے بارے میں یہ نقطۂ نظر ایک وسیع الفکر اور آزاد خیال نقاد کا تو ہو سکتا ہے، کسی کٹر ترقی پسند کا نہیں اور محمد علی صدیقی اپنی اسی ترقی پسندی اور روشن فکری کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔

حواشی

۱- توازن کی جہات، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، مرتبہ: ڈاکٹر قاضی عابد، شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، اپریل ۲۰۰۷ء، ص: ۵۷، ۷۶۔

۲- جہات، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ارتقا مطبوعات کراچی، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۷۔

۳- پس پردہ، ڈاکٹر مجاہد کامران، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۲۔

۴- جہات، ص: ۱۹۔

۵- ایضاً، ص: ۱۱۔

۶- ادراک، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ارتقا مطبوعات کراچی، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۵۔

۷- شہزاد منظر، پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، ص: ۲۰۹

۸- پروفیسر ممتاز حسین، محمد علی صدیقی کا توازن، مشمولہ سات ادیب، ص: ۶۲

۹- ڈاکٹر انور سدید، توازن کا نقاد، مشمولہ اوراق لاہور، مدیر: ڈاکٹر وزیر آغا سالنامہ جنوری فروری ۱۹۷۹ء، ص: ۲۶۱

۱۰- ڈاکٹر محمد علی صدیقی، قومی ثقافت کے اجزائے ترکیبی، مشمولہ سہ ماہی تشکیل، مدیر احمد ہمیش، تشکیل پبلشرز کراچی، شمارہ نمبر ۱۱، ۱۲، ۱۳، جنوری ۹۳ تا جولائی ۱۹۹۴، ص: ۲۳۱-۲۳۲

۱۱- ڈاکٹر محمد علی صدیقی، اشارے، مکتبہ افکار کراچی، اپریل ۱۹۹۴ء، ص: ۷۲، ۱۰۹

۱۲- ڈاکٹر محمد علی صدیقی، محمد حسن عسکری، مشمولہ نئی قدریں حیدر آباد سندھ، مدیر: اختر انصاری اکبر آبادی، شمارہ نمبر ۵-۶، ۱۹۷۸ء، ص: ۲۴